محمد اجمل

# اِقبالؒ — ایک ترقی پسند کی حیثیت سے

پروفیسر ڈبلیو۔سی۔ سمتھ نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں جدید اسلام[۱]'' میں اقبال کی ترقی پسندی پر ایک نہایت پرمغز اور فاضلانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ آپ نے ہمارے سماج کے پس منظر میں اقبال کی نہایت جاذبِ نظر تصویر کھینچی ہے۔ ہاں کئی جگہ لکیریں کچھ ٹیڑھی ترچھی کر دی ہیں۔ تاہم تصویر اس قابل ہے کہ اسے دیکھ کر لطف اُٹھایا جائے۔

آپ اِقبال کے فلسفہ کی پختگی یورپ کے سفر سے منسوب کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ یورپ کی زندگی کے تین رُخ (بالخصوص) اقبال کی حساس اور ذکی فطرت پر اثر انداز ہوئے۔

۱۔ یورپ کے لوگوں میں عمل کے لیے ایک بیقراری، جاری و ساری تھی، ولولہ تھا، جوش اور خروش تھا اور جوش وخروش کی بدولت لوگ جو چاہتے وہی کر دکھاتے۔ سائنس نے زندگی کے ہر گوشہ کی کایا پلٹ دی تھی، صنعت و حرفت، جنگ، علم الاجتماع غرضیکہ تمام فنون سائنس کی رہنمائی میں قدرت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔

۲۔ عمل کے امکانات کی بوقلونی بڑھ رہی تھی، قدرت کو تسخیر کرنے والا انسان کیا نہیں کر سکتا! ایک وقت میں اس کے لیے عمل کی اَن گنت راہیں کھلی ہیں، یہ نہیں کہ قدرت انسان کو امکانات پیش کرتی ہے بلکہ انسان خود اپنی ہمتِ وسعی سے امکانات کی تخلیق کرتا ہے، قدرت مانے یا نہ مانے، امکانات کی اس قدر تنوع کے باعث اخلاق کی نئی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔

---

۱ Modern Islam in India, By W.C. Smith, London, Victor Collancz Ltd. Publication

۳۔ آرزو اور عمل کے ساتھ یورپ کے لوگوں میں ایک ذہنی اور قلبی انتشار بھی تھا، سرمایہ دار اور مزدور کھینچا تانی سے سماج کی تخریب ہو رہی تھی۔ ظلم، نفرت اور افلاس کی نازیبائی موجود تھی۔

یورپ کی حالت سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے اپنے منجمد سماج کو عمل کی دعوت دی اور کہا کہ زندگی پیہم حرکت اور بے قراری میں ہے۔ اس پکار کی تائید میں مسٹر سمتھ فرماتے ہیں کہ پرانے نظام میں تسلیم و رضا کی ضرورت تھی۔ اب سماج نے ایک نیا روپ دھارا ہے۔ اس سماج میں عمل کے امکانات کی بے حد تنوع نے پرانے اخلاقی نظام اور اخلاقی اصولوں کو بے کار کر دیا ہے۔ جاگیرداری نظام میں آج اور کل کے حالات یکساں رہتے تھے۔ چنانچہ طرزِ عمل میں کسی خاص تغیر کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ مگر آج قدرت لحہ بہ لحہ بدل رہی ہے، کل کے حالات اور آج کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسٹر سمتھ کا خیال ہے کہ اقبالؒ نے اسی لیے پرانے اخلاقی اصولوں کی اندھا دھند اور بے جان تقلید کو تحقیر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس نے فرسودہ قوانین کی پیروی کو برا کہتے ہوئے، عشق اور ولولہ کو اخلاق کی جان قرار دیا ہے۔ انسان کو اس عمل کی ضرورت ہے جس میں عشق کی حرارت، توانائی اور لذت ہو۔ قدرت کی طاقتوں کے سامنے ہمیں سرِ تسلیم خم نہیں کر دینا، ہمیں اُن پر غالب آ کر ان کے چلن کو سنوارنا ہے۔ ہمارا مقصد غلبہ ہے، تسلیم اور قناعت نہیں، اور غلبہ پیہم عمل اور ان تھک محنت سے حاصل ہو گا۔ عمل کے اس پیغام کو پرزور بنانے کے لیے لازمی یہ تھا، کہ پرانے منجمد فلسفہ کی جڑیں کھوکھلی کی جائیں۔ چنانچہ اقبال نے چند قدیم مذہبی تصورات کی بیخ کنی کی اور نئے تصورات کی داغ بیل ڈالی۔

مسٹر سمتھ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ قدیم نظریہ تھا کہ خدا ایک مافوق الفطرت ہستی ہے جو کائنات کی حدوں سے پرے زمان اور مکان کے احاطہ سے بعید کسی غیر مرئی مقام پر بیٹھی کائنات پر حکومت کر رہی ہے۔ مگر اقبالؒ نے خدا کو حکومت کی گدی سے اتار دیا اور کہا کہ خدا کائنات سے علیحدہ نہیں بلکہ کائنات کے اندر موجود ہے۔ خدا کو کائنات میں لے آنے سے

کائنات زیادہ پیاری بن جاتی ہے۔ اس لیے قدرت کی رعنائی و رنگینی سے لطف اندوز ہونا اقبالؔ کے مذہب کا ایک لازمی جزو ہے جب خدا دنیا میں رہتا ہے تو دنیا کو چھوڑ کر بنوں میں گوشہ گیری اختیار کرنے والے خدا سے دُوری اختیار کر رہے ہیں۔ خدا کا وصال دنیا میں رہ کر اور کردار کا ایک سیلاب بہا دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

خدا کو دنیا میں بسا دینے سے روح اور مادہ کی دوئی بھی جاتی رہتی ہے۔ جو قدیم تصوف اور فلسفہ کی دکھتی رگ تھی، ہاں، اقبالؔ خودی کی دائمی بقا میں یقین رکھتا ہے۔ مگر یہ ایسی بقا نہیں، جو خود بخود ہاتھ آ جاتی ہے۔ یہ بقا، عمل کا پھل ہے، جس میں عمل کی ہمت ہے۔ وہ غیر فانی ہے، باقی سب فانی! اقبال یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے زوال کے اسباب میں یہ ایک نہایت اہم سبب تھا کہ لوگوں نے روح اور مادہ میں ایک خلیج حائل کر دی تھی۔ صوفیوں نے مادی دُنیا کو ترک کر کے روحانی دُنیا میں بسیرا اختیار کیا اور اسی طرزِ فکر و عمل کی تلقین سے اسلام کی سیاسی جبروت ڈھلنے لگی، مسٹر سمتھ کو اقبالؔ کے اس نظریہ سے اتفاق نہیں، وہ کہتے ہیں کہ رہبانیت، سیاسی زوال کا نتیجہ ہے، سبب نہیں۔ جب حساس لوگوں نے دیکھا کہ مادی دنیا میں سوائے ظلم و ستم، اور انتشار کے اور کچھ نہیں رہا، اور اخلاقی اقدار کے تحفظ کی تمام راہیں بند ہیں تو انہوں نے اقدار کو روح کی دُنیا میں پناہ دی، ہمیں ان صوفیائے کرام کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ماحول کی قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اقدار پر آنچ نہ آنے دی، اور حفاظت سے انہیں ہم تک پہنچا دیا۔ آج سائنس کی مدد سے ہم ان اقدار کی تسکین مادی دنیا ہی میں کر سکتے ہیں۔

اقبال کو اقدار کی اہمیت کا شدید احساس تھا، مگر اس نے کبھی جزئیات پر بحث نہیں کی۔ مثلاً اس نے یہ کبھی نہ بتایا کہ نیک کام کیا ہے؟ اسے اس بات سے زیادہ غرض نہ تھی کہ نیک کام کیا ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کی غرض یہ تھی کہ (اقدار کے حصول کے لیے) ہمیں کچھ کرنا ضرور چاہیے! ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا، تساہل برتنا، زمانہ کو ناسازگار پا کر صبر و رضا کا دامن پکڑنا، موت کے برابر ہے۔ جذبۂ عشق کا برمایا ہوا ایک گناہ، پرانے اخلاقی بندھنوں کی

بے جان تقلید سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ گویا اقبالؒ نے کوئی اخلاقی نظام تعمیر نہیں کیا، مگر ایک اخلاقی نظام کی نہایت مستحکم بنیادیں چھوڑ گیا ہے۔

انقلاب کی محض ہمارے ہاں ہی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی مشرق اور مغرب دونوں جگہ ضرورت ہے۔ مغرب میں علم وفن کمال تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر وہاں محبت اور اخوت نہیں، مشرق میں اقدار کی پرستش تو ہے مگر علم وفن موجود نہیں، مشرق میں جہالت ہے۔ مغرب میں سرمایہ داری، ظلم اور ستم ہے۔ سرمایہ داری سے اقبال کو شدید نفرت تھی۔ چونکہ وہ سرمایہ داری کے اُن عقلی جالوں کو دلائل سے توڑ نہیں سکتا تھا، جو سرمایہ دار اپنے تحفظ کے لیے گاہے گاہے بنتا رہتا ہے، اس لیے وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا تھا۔ اقبالؒ کے پاس سرمایہ داری کی تخریب اور اشتراکیت محض انسانیت سے پیار پر مبنی تھی۔

اشتراکیت کے بارہ میں اقبالؒ کے مختلف اقوال موجود ہیں۔ مغرب کی مذمت کرتے ہوئے، اس نے مارکس کا ذکر کیا ہے، اور کہیں کہیں اس کے خیالات سے مدد بھی حاصل کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو ''اشتراکیت'' سے واقفیت نہ تھی، وہ اشتراکیت کو اس طرح کا مادیت پرست مذہب سمجھتا تھا، جو روحانی اقدار کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارہ میں سوچتے ہوئے، اس نے روح اور مادہ کی دوئی کو صحیح جانا اور اس بات پر یقین کر لیا کہ اشتراکیت مادہ پرست ہے اور رُوحانی اقدار سے بے بہرہ! اسی لیے وہ روس کی دہریت اور لامذہبیت سے متنفر تھا۔ گو اسے روس کے اقتصادی نظام سے ہمدردی تھی۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے وہ اشتراکیت کے بہت قریب آ گیا تھا اور اسلام اور اشتراکیت میں تھوڑا ہی فرق سمجھتا تھا۔ اور وہ یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ مذہب کے سماجی لوازم بھی وہی ہیں، اور یہ جانتا تھا کہ اخلاق سماج ہی میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ اس سماج کے جنم کا منتظر تھا۔ جس کا تار و پود مضبوط اور شخصیتوں سے بنا ہوگا۔

مسٹر سمتھ فرماتے ہیں کہ اقبال نے فرسودہ قوانین اور رسوم کی مذمت کی اور عمل کو سراہا، حالانکہ جن اشعار کا وہ حوالہ دیتے ہیں، ان سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ جذبۂ عشق اپنے

اظہار کے لیے کوئی وسیلہ کیوں نہ ڈھونڈے (چاہے وہ وسیلہ مذہبی احکام کے خلاف ہو) وہ وسیلہ بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عشق کا گرمایا ہوا عمل جو مذہبی رسوم کے سانچہ میں ادا نہ ہو، بہترین عمل ہے۔ یا یہ کہ وہ ہمارا نصب العین ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اقبال کے اشعار سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ پرانے قوانین کے سانچہ میں عشق کو ڈھالنا چاہیے، اسی لیے اس کا خطاب مسلمان قوم سے ہے۔ کیونکہ مسلمان قوم کے پاس وہ سانچے موجود ہیں، عمل کی کمی ہے۔ دوسرے لوگ عمل کر رہے ہیں، مگر ان کے پاس وہ بندھن، وہ قوانین، وہ تعصّبات موجود نہیں جو مسلمانوں کا تنہا سرمایہ ہے، اور اقبال کو یہ خدشہ ہے کہ کہیں وہ لوگ جن کے پاس اسلامی تصورات نہیں، اس کے پیغام سے اپنی آرزو کو سلگا نہ لیں

اس اندیشے سے ضبط آہ میں کرتا رہوں کب تک!
کہ مُغ زادے نہ لے جائیں تیری قسمت کی چنگاری

کیونکہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عمل جو اسلامی تصورات اور تخیلات کی تخلیق نہیں۔ اچھا ہو سکتا ہے، کئی دوسرے اعمال سے بہتر ہو سکتا ہے، مگر بہترین نہیں ہو سکتا۔"

مسٹر سمتھ کا یہ کہنا، کہ پہلے مسلمان خدا کو "مافوق الفطرۃ" سمجھتے تھے، مگر اقبالؒ نے اسے کائنات کے رگ و ریشہ میں جاری کر دیا ہے، کچھ ایسا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے وضاحت سے اپنے نظریہ کو پیش نہیں کیا۔ مگر یہ ضرور کہا ہے کہ خدا "لامحدود ہے، وہ ہماری دُنیا سے علیحدہ نہیں، مگر ممتاز ہے۔"

میں یہ بات بھی نہیں سمجھا کہ خدا کو دنیا میں بسا دینے سے ذوقِ عمل کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا دنیا کے رگ و ریشہ میں موجود ہے، تو نیک و بد کی ذمہ داری انسان کے کندھوں سے اُٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ نیکی اور بدی خدا کی شخصیت کے دو رُخ بن جاتے ہیں، مگر ذمہ داری اقبال کے فلسفہ کی جان ہے۔

گنہگار غیورم، مزد بے خدمت نمی گیرم
ازاں داغم کہ برتقدیر او بستند تقصیرم

ولیم جیمز کی ''تصوریوں'' کو قطعی سے یہی کد تھی کہ ''قطعی'' کی ہمہ گیریت اِنسان کی ذمہ داری کو لوٹ لیتی ہے۔ اگر اقبالؔ کا خدا دنیا کی ''روحِ رواں'' ہے اور نیک ہے، تو ساری دنیا نیک ہے۔ ہم بدی کو دُور کرنے کی زحمت گوارا ہی کیوں کریں؟ میرے نزدیک تو یہ نظریہ ذوقِ عمل کے لیے قاتل ہے، ہاں خدا کو سیار قرار دینے سے ذوقِ عمل جلا حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دُرست ہے کہ اقبالؔ اشتراکیت کو ''مادیت پرست فلسفہ'' سمجھتا تھا۔ مگر اتنی سی بات سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اقبالؔ نے یہاں روح اور مادہ کی دوئی کو صحیح جانا، مسٹر سمتھ روح اور مادہ کی دوئی کو صحیح تصور نہیں کرتے۔ مگر پھر بھی وہ یہ مانتے ہیں کہ صوفیوں نے رُوح کو مادہ سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اگر صوفی روح کو مادہ سے جدا کر سکتے ہیں، تو کیا اشتراکی مادہ کو روح سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اور غالباً یہ صحیح ہے کہ اقبالؔ نے اشتراکیت کو سمجھا نہیں، لیکن وہ اشتراکیت کو ''مادیت پرست'' کہتے ہوئے بھی روح اور مادہ کی دوئی کو غلط جان سکتا ہے۔

☆☆☆